پکارا جاتا ہے۔ ان کا تعلق عمیر بن بیان العجلی سے ہے۔

یہ گروہ اس خیال کی تردید کرتا تھا کہ ان پر موت وارد نہیں ہوتی۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ سب لوگ موت کا شکار ہوتے ہیں۔ اور ان میں ہمیشہ ایسے ائمہ پیدا ہوتے رہتے ہیں جو نبی بھی ہوتے ہیں۔ جعفر کی یہ بھی 'المعمریوں' کی طرح عبادت کرتے تھے۔ اور اسے اپنا رب ٹھہراتے تھے۔ کوفہ کے ایک محلہ کُناسہ میں یہ خیمہ نصب کرتے اور پھر سب جمع ہو کر جعفر کی عبادت کرتے۔ اس پر یزید بن عمر بن ہبیرہ نے عمیر بن البہان کو گرفتار کر لیا۔ اور اسی کناسہ میں موت کی سزا دی۔ اور کچھ لوگوں کو اس نے جیل میں ڈال دیا۔

امیر شکیب ارسلان
ترجمہ: رئیس احمد جعفری

آثارِ فتوحاتِ عرب

مجھ جیسا شخص یورپ کے سبزہ زاروں اور مرغزاروں میں آثارِ عرب کی تلاش و جستجو کرتا ہوا اگر شہر شہر اور کھنڈر کھنڈر گھومتا ہے تو یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ ہر اس شخص کا جو اپنے آپ کو عرب کہتا ہے یہ فرض ہے کہ اپنی عظیم و جلیل قوم کے مٹے ہوئے آثار و نقوش کی تلاش و جستجو میں سرگرداں ہو، اور اپنے آبا و اجداد کے فضائل و مناقب اور معالی ہمم کے آثار جہاں کہیں بھی ملیں محفوظ کر لے، اور ان چیزوں کو اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے ورثہ کے طور پر چھوڑ جائے۔

بلاشبہ اندلس کی سرزمین پر جگہ جگہ عربوں کے آثارِ تہذیب و عمران بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ امتِ عربیہ کی تاریخ میں اندلس پر مسلمانوں کی سلطانی اور فرمانروائی کا دور متعدد اعتبارات سے قابلِ فخر اور ناقابلِ فراموش ہے۔ بلکہ بلا اندیشہ تردید میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ اس کرۂ ارض پر انسان کے جو آثار پائے جاتے ہیں ان کے مقابلہ میں عربوں کے آثار کہیں زیادہ زندۂ جاوید بننے کے مستحق ہیں۔ پھر کسی کو حیرت کیوں ہو۔ اگر ایک عرب اپنے آبا و اجداد کے ان غیر فانی کارناموں، لازوال یادگاروں اور ہمیشہ باقی رہنے والے آثار پر فخر کرتا، ان کی جستجو میں سرگرداں رہتا اور ان کے دیدار کے لیے دور دراز ممالک کی مسافتیں طے کرتا، مختلف جیوں اور گوشوں میں پہنچتا ہے، خود روتا، دوسروں کو رلاتا ہے۔ یہ چیزیں صرف ہمارے مجدِ ماضی کے آیاتِ ناطقہ، اور بیّناتِ قاطعہ ہی نہیں ہیں کہ جن سے ہمیں یہ معلوم ہو کہ گزرے ہوئے زمانہ میں ہم کیا کر چکے ہیں بلکہ

یہ ایک حجتِ ملزمہ اور آیت معجزہ اس بات کی بھی ہے کہ اپنے دورِ حکومت و فرمانروائی میں ہم نے جو کچھ کیا تھا وہ اقتدار کے لحاظ سے بھی کتنا گرانمایہ تھا، اور اس بات کی دلالت بھی ہے کہ اگر ہم تہیہ کر لیں، اپنے اندر پھر وہی روح اور جذبہ پیدا کر لیں جو ہمارے اسلاف میں کارفرما تھا تو گزری ہوئی تاریخ ایک مرتبہ پھر دہرا سکتے ہیں، اور دنیا کو بتا سکتے ہیں کہ ہم جو کچھ تھے وہی پھر بن سکتے ہیں، بشرطیکہ اغیار و اجانب ہمارا دامن پکڑ پکڑ کر سنگِ راہ بننے کی کوشش نہ کریں۔

بلوغ و شعور کی منزل میں قدم رکھتے ہی اندلس کی عربی تہذیب و آثار سے میں ایک طرح کا والہانہ شغف محسوس کرنے لگا۔ وہاں کی تاریخ، وہاں کے حالات و واقعات، وہاں کے اخبار ہر چیز میں میرے لیے ایک غیر معمولی کشش تھی۔ یہاں تک کہ تقریباً چونتیس سال کی کاوش سے جسے بجا طور پر ایک عمر کہا جا سکتا ہے میں نے فرانسیسی سے عربی زبان میں مشہور ادیب و انشا پرداز شاتوبریان کا مشہور افسانہ "بنو سراج کا انجام" عربی زبان میں منتقل کیا۔ جس کا پلاٹ بنو سراج سے تعلق رکھتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے ترجمہ میں حاشیہ کے طور پر اندلس کی تاریخ سے متعلقہ مواد بھی اور یورپین زبانوں سے لے کر شامل کر دیا، جس میں مملکت غرناطہ کے سقوط سے لے کر عربوں کی آخری جلاوطنی کے دَور تک کا سارا افسانہ بیان کر دیا۔ اس لیے کہ تاریخ کا یہ سارا حصہ ہمارے زمانہ میں مجہول صورت اختیار کیے ہوئے ہے۔

میری یہ ناچیز خدمت حسن قبول سے مشرف ہوئی۔ اپنی کتاب میں نہضت عربیہ کی پوری داستان میں نے بیان کر دی تھی۔ جس میں ایسے گوشے بھی تھے جو گدبہ آور تھے۔ جنھیں پڑھ کر لوگوں کی آنکھوں سے سیلاب اشک رواں ہو گیا۔ میں نے ان کارناموں کو اجاگر کیا تھا جن کی تاثیر و تاثر نے یہ رنگ اختیار کر لیا کہ جس نے ایک مرتبہ یہ کتاب پڑھ لی وہ بار بار اپنے آپ کو اس کے مطالعہ پر مجبور پانے لگا۔ کیونکہ یہ اپنی شاندار اور ناقابل فراموش ناکامی، عروج کی انتہا، زوال کی حد آخر، رفعت و سربلندی کا نقطۂ کمال، پستی و زبوں حالی کی آخری منزل تھی۔ یہ کہانی پڑھ کر لوگ روئے بھی اور اپنے ملی آثار گم گشتہ کی تلاش میں سرگرداں بھی ہوئے۔ ایک طرف اپنی قومی سربلندیوں کا تذکرہ ایک نیا ولولہ پیدا کرنے کا

موجب بنتا تھا، دوسری طرف اس کے زوال و ہبوط کی نشان دہی عبرت و موعظت کی کیفیت پیدا کرتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند سال کی مختصر مدت میں میری کہانی "بنو سراج کا انجام" کئی مرتبہ اپنے حواشی کے ساتھ چھپی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔

جرمنی کے شہر میونخ کے ایک مضافاتی قصبہ باغاریہ میں مجھے ایک نادر و نایاب کتاب مل گئی جس کا نام ہے "اخبار العصر فی انقضاء دولۃ بنی نصر"۔ میں نے اس کتاب سے بھی فائدہ اٹھایا، اور حسب ضرورت مواد اس سے لے کر اپنی کتاب میں شامل کر دیا۔

"اخبار العصر" کا مؤلف کون ہے؟ یہ نہیں معلوم۔ لیکن کتاب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مصنف نے بچشم خود سقوط غرناطہ کے لرزہ خیز حوادث اور وقائع کا مشاہدہ کیا تھا۔ وہ اسی زمانہ کا آدمی ہے، اور اس نے جو واقعات درج کیے ہیں یا خود اس کے دیکھے ہوئے ہیں، یا ان لوگوں سے مروی ہیں جنھوں نے یہ واقعات و حوادث اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔

میرا خیال ہے مقری نے جب اپنی کتاب "نفح الطیب" لکھی ہے تو یہ کتاب یعنی "اخبار العصر" اس کے پیش نظر تھی۔ کیونکہ "نفح الطیب" میں سطروں کی سطریں ایسی ملتی ہیں جو اخبار العصر سے لی گئی ہیں۔ بعد میں میں نے یہ کتاب جو میونخ سے مجھے حاصل ہوئی تھی اور جس کا مؤلف نامعلوم ہے، مطبعۃ المنار مصر سے بھی شائع کر دی تھی۔ اس کے ساتھ چار شاہی فرامین بھی تھے جو سلطان ابوالحسن علی بن الاحمر (یہ ابوعبداللہ کا والد ہے جو اندلس کا آخری فرمانروا تھا اور جس نے غرناطہ کی کنجیاں بادشاہ فرڈی ننڈ کے سپرد کی تھیں) کے تھے۔

لیکن یہ جو کچھ تھا مطالعہ اور تحریر کا نتیجہ تھا۔ اندلس کے بارے میں میرے دل کے اندر جو جذبہ مچل رہا تھا وہ صرف قلم کاری سے تسکین نہیں پا سکتا تھا۔ حسرت یہ تھی کہ آنکھیں سرزمین اندلس کے دیدار سے شاد کام ہوں۔ میں وہاں کے شہروں میں گھوموں۔ گلیوں کے چکر کاٹوں اور ایک ایک چپے اور گوشے تک پہنچوں۔ جو کچھ پڑھ چکا ہوں اسے آنکھوں سے دیکھوں۔

لیکن انسان جو کچھ چاہتا ہے ضروری نہیں ہے وہ پورا بھی ہو، اور اگر پورا ہو بھی تو یہ قطعاً

ضروری نہیں کہ اسی وقت پورا ہو جب دل میں ترنگ اٹھے۔ رہ رہ کر میرے دل میں کسک پیدا ہوتی کہ اس دیار تک پہنچوں جہاں ہمارے آباو اجداد نے فتح و کامرانی کے جھنڈے گاڑے تھے۔ جہاں انھوں نے ایک نئی تہذیب کی تخلیق کی تھی۔ جہاں پہنچ کر ایک نئی دنیا انھوں نے بسائی تھی، وہاں جاؤں، وہاں کے حالات جمع کروں۔ جو کچھ پڑھا ہے۔ جو کچھ سنا ہے، جو کچھ دیکھا ہے قلم کی مدد سے کاغذ پر جمع کر دوں۔ لیکن عوائق دامن پکڑتے رہے۔ مشغولیتیں عناں گیر ہوتی رہیں کبھی کبھی تو ایسا اندیشہ ہوتا کہ شاید یہ آرزو پوری نہ ہو سکے، اور موت کا پیامبر دیار اندلس کے بجائے دوسری دنیا میں لے جائے۔ لیکن خدائے رحمٰن و رحیم کا شکر و سپاس کس زبان سے ادا کیجیے کہ بالآخر یہ حسرت دیرینہ پوری ہوئی۔ اور سر و سامان سفر بہم پہنچا کر میں نے اندلس کی راہ لی۔ یہ واقعہ ۱۳۴۸ھ (۱۹۳۰ء) کا ہے۔

یہ زمانہ وہ تھا کہ میں جنیوا میں مقیم تھا، اور جمعیت اقوام (League of Nations) کے اجلاس پابندی کے ساتھ وہاں ہو رہے تھے۔ اس موقع پر حالات و مصالح کا تقاضا یہ تھا کہ میں جنیوا میں مقیم رہوں۔ میرے بعض دوستوں نے مشورہ دیا کہ اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلہ میں مجھے جلد بازی سے کام نہ لینا چاہیے، اور اگلے موسم سرما یا موسم بہار میں سفر ہسپانیہ کا ارادہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ اندلس کے جن مقامات پر میں جانا چاہ رہا تھا وہاں کی شدید گرمی میرے لیے ناقابل برداشت ہوگی۔ مگر ان مشوروں کی پذیرائی میرے لیے ممکن نہ تھی۔ سفر کا ارادہ مستحکم ہو چکا تھا، اور اب میں کسی وجہ سے بھی اس میں تغیر یا تاخیر کرنے پر تیار نہ تھا۔ گزشتہ کئی سال سے یہ آرزو میرے دل میں مچل رہی تھی۔ جب بھی میں نے سفر کا ارادہ کیا کوئی نہ کوئی مانع پیدا ہو گیا، اور مجھے اپنا ارادہ ملتوی کر دینا پڑا۔ اب اگر میں پھر سرما اور گرما، یا ربیع و خریف کے چکر میں پڑ جاتا تو نہ جانے پھر کب نوبت آتی۔

یورپ کی سیاحت خوب جی بھر کے کر چکا ہوں۔ شاید ہی کوئی شہر ہو جہاں میرے قدم نہ پہنچے ہوں۔ بعض جگہ تو کئی کئی مرتبہ گیا ہوں، اور وہاں کے حالات و واقعات سے اچھی طرح دوچار

ہوا ہوں۔ یورپ کے شمال میں اسکنڈے نیویا اور جنوب میں بلاد ہسپانیہ کے سوا کوئی مقام ایسا نہیں ہے جو میرا دیکھا ہوا نہ ہو۔ جہاں تک اسکنڈے نیویا کا تعلق ہے ہم جیسے لوگوں کے لیے وہاں جانا اور نہ جانا برابر ہے۔ کیونکہ نہ اس کی کوئی خلاص کشش ہے۔ نہ کوئی خاص بے رغبتی۔ گئے تو ٹھیک نہ گئے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اندلس کا معاملہ دوسرا ہے۔ بلوغ و شعور کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلا جو جذبہ ابھرا، وہ یہی تھا کہ جس طرح بھی ہو وہاں پہنچا جائے۔ ہم جیسے شخصوں کے لیے اس سفر میں تاخیر کم از کم اپنے ارادے کی حد تک تو مناسب نہیں، اور اب یہ فرصت جو ہم پہنچی، اور یہ وقت جو ملا تو چند ہی روز کے اندر سارے مراحل طے کر کے مسافر اپنے سفر پر چل کھڑا ہوا۔

چونکہ اس سفر کا مقصد اصلی یہ تھا کہ آثار عرب کے سلسلہ میں یہ بھی معلوم کیا جائے کہ دیار مغرب میں وہ کس طرح آئے اور کہاں کہاں پہنچے۔ لہذا ہمارے لیے یہ ضروری تھا کہ سب سے پہلے اس سلسلہ میں ہم سرزمین فرانس کا رخ کریں۔ جہاں ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں زمین کو کچلتی ہوئی پہنچ گئی تھیں۔ بلکہ جنوبی فرانس میں تو انھوں نے کشور کشائی کا پرچم بھی لہرایا تھا، جس کے بعد بلادِ فرنگ میں بھی وہ اسی طرح سے پہنچے جس طرح بلاد قوط (گوتھ) اور جلالقہ وغیرہ ممالک اہم مغرب کے ممالک میں وہ مظفر و منصور بن کر داخل ہو گئے تھے۔ جہاں انھوں نے دشمن کی قوت پارہ پارہ کر دی تھی۔ اور خود ایک مستحکم چٹان کی صورت اختیار کر لی تھی۔

اب میری داستان سیاحت سنیئے:

۱۷ر جون ۱۹۳۰ء،

نوران ہو کر میں پیرس پہنچا۔ رات بھر یہیں رہا۔ میرے یہاں پہنچنے کی اطلاع دو پرجوش اور مستعد نوجوانوں کو ہو گئی تھی جن کا شمار بہترین ادبا مغاربہ میں ہوتا ہے۔ ایک سید احمد بلافریج، دوسرے سید محمد الفاسی۔ ان میں سے اول الذکر بیوتات اندلسیین کے ذوائب میں سے ہیں، اور ثانی الذکر اندلس کے فہرین کے جد کی آل میں۔ اور فاس کے اعیان میں جن کا شمار ہوتا ہے۔ ابھی ریل سے اترا بھی نہیں تھا کہ اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر یہ دونوں نوجوان خوش آمدید کہنے کے لیے موجود تھے۔

ہم سب لوگ اسٹیشن سے باہر نکلنے کے بعد ایک ہوٹل پہنچے۔ جس کا نام اولیان پالاس ہے اور جو شارع برون میں (Boulevard Brune) میں واقع ہے۔ میں نے ان دونوں سے اپنا مقصد سفر بیان کیا۔ یہ لوگ یونیورسٹی میں اپنا ٹرم ختم کرنے کے بعد عازم وطن ہو رہے تھے۔ لیکن انھوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس سیاحت میں کچھ عرصہ تک وہ میرے ساتھ رہیں گے۔ میں بھی اس پر تیار ہو گیا۔

میرے پیرس پہنچنے کے دوسرے دن شام کے طلبہ کی ایک جماعت ہم سے ملنے آئی۔ ان لوگوں سے ملاقات کر کے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ پھر ہم لوگ ایک عربی ریستوران میں جمع ہوئے، اور وہاں مختلف معاملات و مسائل پر تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر سید محمد فاسی اور احمد بلافریج کے ساتھ میں مکتبۂ غوتنر میں گیا۔ اس مکتبہ میں کتب شرقیہ ہر طرح کی مل جاتی ہیں۔ یہاں سے میں نے کئی کتابیں جو اندلس سے متعلق تھیں خریدیں۔

ہوٹل اولیان پالاس کے پاس جب میں پہنچا تو بالکل اتفاقاً حسین رؤف بے سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ یہ اس جنگی جہاز حمیدیہ کے مشہور کپتان تھے جس نے پہلی جنگ عظیم کے نہایت نازک معرکوں میں نہایاں حصہ لیا تھا، اور جو ایک عرصہ تک حکومت ہسپانیہ کے امیر البحر کے منصب پر فائز رہے تھے۔ رؤف بے سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ کیونکہ ۱۹۲۴ء میں بمقام آستانہ ہم دونوں کافی عرصہ تک ایک ساتھ رہے تھے۔

یہیں رحمی بے بھی مجھ سے ملاقات کے لیے آئے۔ یہ جنگ عظیم کے زمانہ میں ازمیر کے گورنر تھے اور انجمن اتحاد و ترقی کے ممتاز ارکان میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ترکیہ کے قابل فخر لوگوں میں ایک یہ بھی تھے۔ میرے اور میرے ابن عم امین مصطفیٰ ارسلان کے یہ بڑے گہرے دوستوں میں ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اچانک اور غیر متوقع طور پر رؤف بے اور رحمی بے سے مل کر مجھے بے اندازہ مسرت ہوئی۔ جن سے ہماری دوستی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ان لوگوں کو لے کر میں عربی ریستوران میں گیا جہاں ہم نے کھانا کھایا جو مغربی طرز کا پکا ہوا تھا۔ اسی دوران میں عربی موسیقی کا رس بھی ہمارے

کانوں میں ٹپکتا رہا۔ خاص طور پر نغمۂ اندلس۔ یہ رات بھی کتنی عجیب تھی۔ یہ دن بھی کتنا دلفریب تھا
تقریباً پانچ روز تک پیرس میں قیام رہا۔ پھر ریل پر بیٹھ کر میں تولوز یعنی طلوزہ [1] روانہ
ہوا۔ اسٹیشن پر پیرس کے جوانان عرب الوداع کہنے کے لیے موجود تھے۔ ان سب نے نعرہ
لگایا:

"عرب زندہ باد"

اور اسٹیشن اس نعرہ سے گونج اٹھا۔

آٹھ گھنٹے کی مسافت کے بعد ہماری ریل طلوزہ پہنچی۔ اسٹیشن سے قریب ہی ایک ہوٹل
ترمینوس [2] میں ہم ٹھہر گئے۔

دوسرے روز ہم قرقشونہ [3] روانہ ہوئے۔ یہ مقام آثار عرب کا گہوارہ ہے۔ شہر اور
قلعہ کی میں نے زیارت کی۔ شہر پناہ کی دیواروں پر چڑھا، اور گھوما۔ تقریباً دو گھنٹے کے گشت
کے بعد پھر طلوزہ واپس آگیا۔ اب شام ہو چکی تھی۔ قرقشونہ اور طلوزہ کی مسافت ریل سے دو
گھنٹے سے زیادہ کی نہیں ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آغاز کلام فرانس کے اس حصہ سے کروں جہاں عربوں نے
پرچم فتح و ظفر لہرایا تھا۔ پھر ہسپانیہ کی طرف متوجہ ہوں۔ جہاں کئی سو برس تک عربوں نے حکومت
کی تھی۔ یہ اس لیے کر رہا ہوں کہ میرے سفر کا آغاز فرانس سے ہوا ہے۔ اور جب کہ اس سفر سے
میرا مقصد یہ ہے کہ عرب کے آثار و اخبار کا استقصاء کروں، خواہ وہ یورپ کے کسی گوشہ

---

[1] اس کا موجودہ نام Toulouse ہے۔

[2] Terminus

[3] جسے اب Cacassonne کہتے ہیں۔

اور قطعہ میں کیوں نہ ہوں، تو مجھے اس بندھے ہوئے راستہ سے صرف اس صورت میں روگردانی کرنا پڑے گی جب سیاق بحث کا اقتضا ہو۔

اگر میں پہلے اندلس کے اس مقام پر پہنچ جاتا جہاں عرب پہلے پہل اترے تھے تو پھر ترتیب کا اقتضا یہ ہوتا کہ سب سے پہلے جبل طارق کو زیر بحث لاتا۔ پھر جزیرۂ خضرا، پھر شریش، پھر قرطبہ، پھر طلیطلہ تک، یعنی جنوب سے لے کر شمال تک پہنچتا۔ اور اس کے بعد اس منزل کو ختم کر کے اربونہ، قرقشونہ، نیم، افینیون سے لے کر کوہ آلپس اور مابین اطالیہ و فرانس و سویزرلینڈ میں آثار عرب کی جستجو کرتا۔

اور واقعی میں ایسا ہی کرتا اگر جلاوطن نہ ہوتا، اور اپنے وطن شام میں میرا قیام ہوتا۔ پھر اندلس تک کا میرا سفر اسی راستہ سے ہوتا جسے ہمارے اجداد نے طے کیا تھا۔ لیکن غریب الوطنی نے مجھے وطن سے دور لا پھینکا ہے۔ میرا ملک غلام ہے اور میں یورپ میں بود و باش اختیار کرنے پر مجبور ہوں۔ لہٰذا اندلس کا سفر بجائے جنوب کے شمال کی طرف سے مجھے کرنا پڑ رہا ہے یعنی جہاں میں اب مقیم ہوں۔ گویا دوسرے الفاظ میں میرا آغاز سفر اس جگہ سے ہو رہا ہے جہاں عربوں کے فتوحاتِ یورپ کی انتہا ہوئی تھی۔ نہ کہ وہاں سے جہاں سے انھوں نے مارچ کیا تھا۔

بہرحال مقصود جب یہ ٹھہرا کہ آثار سلف کا استقرا کیا جائے اور ان کے نقوش قدم کیے جائیں۔ جہاں جہاں بھی تاریخ رہنمائی اور یورپ کی سرزمین نشان دہی کرے تو پھر تعیین مکان اور التزام مقام کی کوئی خاص ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ہم وہ سب کچھ بیان کریں گے جو ہم نے دیکھا، اور عربوں کے فتوحات یورپ کے بارے میں ہم نے معتبر اور مستند کتابوں سے حاصل کیا۔ لہٰذا کسی خاص ترتیب کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ ہم جنوبی فرانس، شمالی اٹلی، کوہِ آلپس کے مضافات اور وہ مقامات جو آج کل تین ملکوں یعنی فرانس، اٹلی اور سویزرلینڈ کے درمیان واقع ہیں سب کو زیر بحث لائیں گے۔

درحقیقت میرا موضوع عربوں کی وہ یادگار اور ناقابل فراموش جنگیں ہیں جو انھوں

نے سرزمین فرانس پر، شمالی اطالیہ میں اور قلب سویزہ (سویزرلینڈ) میں لڑیں۔ میرا یہ دعویٰ شاید خودستائی پر محمول نہ کیا جائے کہ عربی زبان میں اس موضوع پر یہ پہلی مستقل تاریخ ہے [1]۔

---

[1] اور واقعی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ امیر شکیب ارسلان نے یہ کتاب لکھ کر وقت کی اہم ضرورت پوری کر دی ہے، اور اس معاملہ میں قابل رشک حیثیت حاصل کر لی ہے، کیونکہ انگریزی، فرنچ اور عربی زبان تک میں اس اہم موضوع پر اتنا مکمل اور مستند مواد کسی ایک کتاب میں نہیں ملتا۔

(رئیس احمد جعفری)